رجسٹرڈ نمبر L. 922
فون نمبر ——— 29

۸ر مارچ ۱۹۷۲ء

اسسٹنٹ ایڈیٹر
آل احمد سرور

قیمت سالانہ چھ روپے
قیمت فی کاپی بیس پیسے

اشاعت کی تاریخیں
۱ ، ۸ ، ۱۵ ، ۲۲

ہفتہ وار ہماری زبان

جلد ۳۱ | انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) | شمارہ ۱۰

اداریہ

اردو گھر

اردو دوستوں کو یہ اطلاع دیتے ہوئے ہمیں بڑی مسرت ہے کہ "اردو گھر" کی تعمیر کا کام اب خاصی تیزی سے ہو رہا ہے۔ بیچ میں جنگ کی وجہ سے اور لوہے کی فراہمی میں دقت کی وجہ سے رفتار سست ہو گئی تھی، مگر اب ٹھیکے دار کا کہنا ہے کہ اگلے تین مہینے میں عمارت کا ڈھانچا مکمل ہو جائے گا۔ اب تک انجمن اپنے زر محفوظ میں سے جو اس کام کے لئے وقف تھا خرچ کر رہی تھی، مگر اب یہ قوی امید ہو گئی ہے کہ حکومت ہند کی موعودہ گرانٹ کا نصف یعنی دو لاکھ ہمیں اس ماہ کے آخر تک موصول ہو جائے گا۔ ٹھیکے دار سے معاہدہ یہ ہے کہ وہ اکتوبر تک عمارت مکمل کر دے گا۔ اس کے بعد کچھ وقت فرنیچر، بجلی، پانی کی فراہمی میں لگے گا۔ بہرحال ہمارے پروگرام کے مطابق آخر ۷۲ء تک یا شروع ۷۳ء میں ہم اپنا دفتر دہلی منتقل کر سکیں گے۔ ۱۹۵۳ء میں انجمن کے قیام کو پچاس سال ہو جائیں گے، مجلس عام نے اپنے سنہ کے اجلاس میں یہ طے کیا تھا کہ ۱۹۷۳ء میں انجمن کی طلائی جوبلی منائی جائے اور اس کی ساری تقریبات اردو گھر میں ہوں۔ مجلس عام جب جوبلی کا پروگرام طے کرلے گی تو اس کا اعلان کیا جائے گا۔ ہم ان اردو دوستوں کے ممنون ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر اردو گھر کے لئے چندہ دیا ہے، مگر ہمیں یہ اعتراف بھی کرنا پڑتا ہے کہ اب تک عام طور پر جو عطیات دئے گئے ہیں اور جن کی فہرست ہماری زبان میں شائع ہو چکی ہے ان کی تعداد ہماری توقع سے بہت کم اور اردو کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کی بڑی تعداد کو دیکھتے ہوئے کچھ بھی نہیں ہے، ہمارا خیال تھا کہ مجلس عام کے ممبروں، ریاستی شاخوں، مقامی شاخوں اور ہماری زبان کے خریداروں کی مدد سے ہم ایک لاکھ روپیہ ضرور جمع کر لیں گے۔ انجمن کے اپنے سرمائے کے علاوہ جو ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ ہے، چار لاکھ حکومت ہند سے ملنے والا ہے۔ بیس ہزار کا عطیہ ہمیں کشمیر کی حکومت سے موصول ہوا ہے جس کے لئے ہم کشمیر کے بڑے وزیر جناب میر قاسم کے ممنون ہیں۔ اس کے علاوہ بیس ہزار کی رقم عام عطیات سے جمع ہوئی ہے۔ گویا لگ بھگ چھ لاکھ کا انتظام تو ہو جائے گا، مگر ہمیں ابھی عطیات اور عام چندے سے تین لاکھ کی رقم کا اور انتظام کرنا ہے۔ عطیات کے لئے ہم بڑے قومی اداروں، مخیّر حضرات اور ریاستی حکومتوں سے رجوع کر رہے ہیں لیکن عام چندے سے ایک لاکھ کی رقم ضرور جمع ہو جانی چاہئے اس مد میں ابھی تک صرف بیس ہزار جمع ہوئے ہیں۔ گویا اگلے چھ مہینے میں اسّی ہزار کی رقم عام چندے سے ضرور مل جانی چاہئے۔ جن حضرات کے پاس ہماری رسید کی کتابیں ہیں وہ ازراہ کرم اپنے حصے کا چندہ جلد روانہ کر دیں اور حساب صاف کرالیں۔ جن حضرات کو کسی وجہ سے اب تک چندہ کرنے کا موقع نہیں ملا وہ

ازراہ کرم جلد اپنی مہم شروع کردیں۔ اردو گھر بہرحال بنے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کے محسنوں میں اردو دوستوں کی کتنی بڑی تعداد کا نام ہوتا ہے۔

اردو ادب کا سیدین نمبر۔

ہماری زبان میں جنوری میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ سہ ماہی اردو ادب کا دوسرا شمارہ جو اپریل میں شایع ہوگا سیدین نمبر ہوگا، لیکن چونکہ ہمیں اس سلسلے میں ابھی وہ تمام مضامین موصول نہیں ہوئے جن کی ہم ضرورت سمجھتے ہیں اور ہمارے بہت سے معاونین نے انھیں مکمل کرنے کے لئے ہم سے مزید وقت مانگا ہے، اس لئے ہم نے اب یہ طے کیا ہے کہ اردو ادب کا تیسرا شمارہ جو جولائی میں شایع ہوگا، سیدین نمبر ہو۔ اس کے لئے تمام مضامین ہمیں ۱۵ رمئی تک مل جانے چاہئیں۔ سیدین صاحب ہمارے ملک کے بہت بڑے دانشور، ماہر تعلیم، ادیب، مفکر اور مصلح تھے۔ انھوں نے انگریزی اور اردو دونوں میں بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ خرابی صحت کے باوجود آخر دم تک تصنیف و تالیف میں مصروف رہے۔ سیدین نمبر میں ان کی شخصیت اور کارناموں کے مختلف گوشوں پر مضامین کے علاوہ، ان کی تحریروں کے نمائندہ اقتباسات اور ان کی نامکمل خود نوشت کے کچھ اجزا بھی شایع ہوں گے۔ ہمیں توقع ہے کہ اس نمبر سے سیدین مرحوم کی شاندار خدمات کا مناسب اعتراف ہو سکے گا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مجسمہ

۱۵ر جنوری کے شمارے میں ناظرین ہماری زبان کو یہ اطلاع دی جا چکی ہے کہ مشہور مجسمہ ساز اور مصور طاہر ایم سید اردو کے اہم ادیبوں اور شاعروں کے مجسموں کا ایک سیٹ تیار کر رہے ہیں۔ اسی پلان کے تحت انھوں نے حال ہی میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مجسمہ بھی مکمل کر لیا ہے۔ طاہر ایم سید نے رشید صاحب کی عظیم شخصیت کو اس مجسمے میں ویسی ہی کامیابی سے پیش کیا ہے جیسی ہنرمندی سے وہ غالب کے مجسمے میں غالب کی شخصیت کی گرفت کر چکے ہیں۔

• اکبر علی خاں

نظام اردو خطبات

نظام اردو خطبات شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی کے زیر اہتمام ٹیگور ہال میں پیر، منگل ۱۲ر اور ۱۶ر مارچ ۱۹۸۲ء کو ساڑھے ۵ بجے شام اوراق مصور، عہد وسطیٰ کی دلی کے موضوع پر جناب پروفیسر خلیق احمد نظامی ڈائرکٹر مرکز مطالعات تاریخ و صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ خطبات دیں گے۔ پروفیسر ڈاکٹر سید نورالحسن وزیر ریاست امور تعلیم و بہبود (ہند) پہلے خطبے کی اور دوسرے خطبے کی پروفیسر ڈاکٹر گرسروپ سنگھ وائس چانسلر دہلی یونی ورسٹی صدارت فرمائیں گے۔

• خواجہ احمد فاروقی صدر شعبۂ اردو

صفحہ ۱۱ سے آگے

بل پر بار پانا چاہتی ہے، ناصر کاظمی کے زوال کا اشتہار دے دیا۔ کچھ مدیران کرام نے، جو چلتے ہوئے نیشنوں کے سہارے اپنے نام کی دوکان چمکاتے ہیں، انھیں فرسودہ سمجھ کر دوسروں کے راگ گانے شروع کر دئے۔ مگر ناصر کاظمی زندہ رہے۔ وہ طیور کے نغمات سحر گاہی سننے کے لئے چپ تو ہو گئے، مگر جب بھی رات آئے گی تو اُن کی آواز شمع کی لو بن کر بکھر جائے گی۔ ہماری شب بیداریاں اُن سے کلام کرتی رہیں گی، ہمارے تخیل کی آوارہ اڑانیں انھیں کھوجتی اور پاتی رہیں گی، ہماری آواز کے طیور اُن کے گائے ہوئے نغمے ہر صبح دہراتے رہیں گے۔ راتوں کو جاگنے اور باتیں کرنے والا شاعر ہم سے آج بھی باتیں کر رہا ہے سنئے ۔

ہم نے آباد کیا ملک سخن   کیسا سنسان سماں تھا پہلے

دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر   کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر   اداسی بال کھولے سو رہی ہے

شام سے سوچ رہا ہوں ناصر   چاند کس شہر میں اترا ہوگا

چلے تو ہیں جرس گل کا آسرا لے کر
نہ جانے اب کہاں نکلے گا صبح کا تارا

میں سو رہا تھا کسی یاد کے شبستاں میں
جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے

عبد القوی دسنوی

نسخہ حمیدیہ یا نسخہ بھوپال

۱۹۶۸ء کی ابتدا ہی سے جب جشن غالب صدی کی تیاریاں شروع ہوئیں تو بھوپال میں نسخۂ بھوپال کی دوبارہ تلاش جاری ہوئی میں بھی اس کی جستجو میں شروع ہی سے شریک ہو گیا، چنانچہ مختلف خاندانوں میں چھان بین کی، مختلف گھروں میں گیا اور مختلف لوگوں سے ملا اور اس کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی، لیکن اس قدر کوشش اور تفحص و تلاش کے بعد بھی کوئی نتیجہ نہ نکل سکا اور اس نسخہ کا سراغ لگانے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ البتہ اس دوران اکثر لوگوں نے اس کے حاصل ہو جانے کی امید دلائی۔ ایک دن ایک صاحب نے خوش خوش یہ خبر دی کہ وہ نسخہ ان کے پاس ہے۔ یہ سن کر میری مسرتوں کی انتہا نہ رہی چنانچہ اس کے دیکھنے کے لئے ان سے وقت لیا اور وعدے کے مطابق ان کے گھر پہنچا، لیکن جب انھوں نے میرے سامنے نسخۂ بھوپال کی جگہ نسخۂ حمیدیہ لاکر رکھا تو میری حیرت اور افسوس کی انتہا نہ رہی اور اس کا احساس ہوا کہ یہ حضرت نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ بھوپال میں فرق محسوس نہ کر سکے انھیں نہیں معلوم کہ نسخۂ بھوپال اور مطبوعہ کلام مل کر نسخۂ حمیدیہ تیار ہوا ہے اور نہ ہی نسخۂ حمیدیہ میں مفتی محمد انوار الحق کی یہ تحریر ان کی نظر سے گزری ہے:

"چونکہ ارادہ یہ ہے کہ ناظرین کے سامنے غالب کے کلام کا ایک مکمل مجموعہ پیش کیا جائے اور ساتھ ہی قلمی اور مروجہ دیوانوں کے شعر بھی پہلو بہ پہلو دکھائے جائیں تاکہ یہ بات آئینہ ہو جائے کہ اصل دیوان میں سے کون کون سے شعر حذف کر دئے گئے تھے اور پھر بعد میں غالب نے ان میں کیا کیا ردو بدل کیا۔ اس لئے اس کتاب میں یہ صورت اختیار کی گئی ہے کہ ہر ایک ردیف میں پہلے دونوں دیوانوں کی ہم طرح غزلوں کو لکھا ہے اور ان میں اول قلمی نسخہ کی غزل بجنسہٖ نقل کر دی ہے اور اس میں جو شعر مروجہ دیوان میں موجود ہیں ان کے سامنے "م" لکھ دیا ہے، تاکہ ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ ابتداً یہ غزل اس طرح کہی گئی تھی اور اس میں فلاں فلاں اشعار (جن کے سامنے "م" لکھا ہوا ہے) مروجہ دیوان میں موجود اور دونوں دیوانوں میں مشترک ہیں۔ اس کے بعد اس طرح کے جو شعر قلمی دیوان کی کتابت یعنی ۱۲۳۷ھ کے بعد کہے گئے ہیں اور اب مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں ان کو لکھ دیا ہے" تاکہ پوری غزل پیش نظر ہو جائے[1]......"

اس دوران غالب سے متعلق مضامین اور تحریروں کے مطالعہ کے بعد اس کا بھی علم ہوا کہ بعض حضرات نے اپنی تحریروں میں بھی اس فرق کو (نسخۂ حمیدیہ اور نسخۂ بھوپال) ظاہر ہونے نہیں دیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"نسخۂ حمیدیہ سے مراد غالب کے دیوان کا وہ قدیم ترین نسخہ ہے جسے خود غالب نے بہ عمر ۱۹ سال ردیف وار مرتب کیا تھا اور جس میں حذف و اضافے کے بعد ان کا منتخب کلام موجودہ اردو دیوان کی صورت میں منظر عام پر آیا ہے[2]۔"

"دیوان غالب کا سب سے قدیم الکتابت مخطوطہ نواب فوجدار محمد خاں کا مملوکہ سمجھا جاتا تھا جس کا سن کتابت ۱۸۲۱ء ہے یہ مخطوطہ نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ قدامت کتابت کے اعتبار سے نسخۂ شیرانی اس سے اگلا قدم ہے۔ نسخۂ شیرانی پر اگرچہ سن کتابت درج نہیں لیکن محققین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ نسخۂ حمیدیہ کے بعد کتابت کیا گیا ہے کیونکہ اس نسخہ میں بعض ایسی غزلیات شامل ہیں جو نسخۂ حمیدیہ کی کتابت (۱۸۲۱ء) کے بعد کہی گئی ہیں[3]۔"

"نسخۂ حمیدیہ کی کتابت کے وقت غالب کی عمر صرف چوبیس سال کی تھی[4]۔"

"........ یہ سب کچھ بجا اور درست لیکن مروجہ دیوان میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں جنھیں سمجھا اور سمجھانا کارے دارد۔ اس کے ساتھ ہی نسخۂ حمیدیہ میں بلند پایہ اشعار کی کمی نہیں ہے[5]۔"

"........ غالب نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ نسخۂ حمیدیہ سے ایک تعداد میں اشعار چن لیے۔ انھوں نے نسخۂ حمیدیہ والے اشعار پر نظر ثانی کی[6]۔"

---

[1] دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ ص ۱۰

[2] ڈاکٹر فرمان فتحپوری۔ غالب نسخۂ حمیدیہ کی روشنی میں، ماہ نو جنوری فروری ۱۹۶۹ء

[3] پیش لفظ۔ نسخۂ شیرانی۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور ص ۱

[4] وجاہت علی سندیلوی۔ باقیات غالب ص ۳۰

[5] یوسف جمال انصاری۔ کلیات غالب اردو مرتبہ نظیر لدھیانوی، صفحہ ۱۰۶

[6] کسری منہاس۔ غالب کی اصلاحیں نقوش غالب نمبر ۱ ص ۴۴۳

"اگر حمیدیہ گم نہ ہوا ہوتا تب بھی یہ نسخہ اس لئے قابل قدر تسلیم کیا جاتا کہ یہ اقدام بھی تھا اور خود بقلم شاعر بھی۔"[۴]

"جب یہ سب کچھ ہو چکا تو ایک ڈرامہ شروع ہوا ۷/اپریل ۱۹۶۹ء کو الجمعیۃ میں اس مضمون کا ایک اشتہار چھپا کہ کسی صاحب کے پاس غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان اردو کا مخطوطہ ہے جو نسخہ حمیدیہ سے پہلے کا ہے۔"[۵]

"جس نسخہ نادرہ کا افتتاح ہمیں یہاں لایا ہے اس کی تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں، لیکن انتہائی تعجب کا مقام ہے کہ یہ نسخہ بھی بھوپال پہنچا جہاں اس سے پہلے یا بعد وہ نسخہ پہنچ چکا تھا جو اب "نسخہ حمیدیہ" کہلاتا ہے۔"[۶]

"نسخہ حمیدیہ کے اشعار پر غور کرنے سے ایک اور بات واضح ہوتی ہے۔ یہاں غالب کے بہت سے بعد کے اشعار اور تراکیب کا نقش اول نظر آتا ہے یعنی غالب کا تخیل نسخہ حمیدیہ کی تکمیل تک صورت گر اور خلاق ہو گیا تھا گو خیال کی پری ابھی آرائش جمال سے فارغ نہیں ہوئی تھی۔"[۷]

"...... نسخہ حمیدیہ کی کتابت کی تکمیل ۱۸۲۱ء میں ہوئی یعنی گل رعنا کی تالیف سے تقریباً سات سال پہلے اور نسخہ شیرانی کے متن کی کتابت نسخہ حمیدیہ کے کئی سال بعد لیکن گل رعنا کی تالیف سے بہت پہلے مکمل ہوئی۔"[۸]

"اردو کلام کو بترتیب ردیف جمع کرنے کا کام ماہ صفر ۱۲۳۷ھ (آخر اکتوبر ۱۸۲۱ء) سے قبل انجام کو پہنچ چکا تھا۔ جو نسخہ حمیدیہ کی "تاریخ کتابت" ہے آئندہ اسی نسخہ میں کمی بیشی ہو کر موجودہ دیوان وجود میں آیا۔"[۹]

"نسخہ حمیدیہ (مکتوب یکم نومبر ۱۸۲۱ء) اپنے سن کتابت کے تخمیناً سو برس کے اندر ڈاکٹر بجنوری (وفات نومبر ۱۹۱۸ء) کی زندگی ہی میں دستیاب ہو گیا تھا لیکن اسے طباعت و اشاعت کی منازل طے کرتے کرتے ایک صدی (سن کتابت سے) کچھ زیادہ ہی زمانہ گزارنا پڑا۔"[۱۰]

جولائی ۱۹۶۹ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے نسخہ حمیدیہ شائع کیا ہے جسے پروفیسر حمید احمد خاں نے مرتب کیا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ نسخہ حمیدیہ مرتبہ مفتی محمد انوار الحق کی طرح اس میں متداول دیوان غالب شامل نہیں ہے بلکہ صرف نسخہ بھوپال کو شائع کیا گیا ہے جیسا کہ مرتب نے خود تحریر کیا ہے:

"میں نے آئندہ اوراق میں بھوپال کے مخطوطے کی نقل پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے اور متداول دیوان سے اس ابتدائی متن کا مقابلہ خود قارئین کی بینش و دانش پر چھوڑا ہے۔"[۱۱]

مجھے اس کتاب کے نام سے اختلاف ہے اس کا نام "نسخہ بھوپال" ہونا چاہیے تھا نہ کہ "نسخہ حمیدیہ"۔ اس لئے کہ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے نسخہ حمیدیہ تو اس دیوان کا نام ہے (جسے نواب حمید اللہ خاں نے مفتی انوار الحق صاحب کے ذریعہ ۱۹۲۱ء میں شائع کرایا تھا) جو نسخہ بھوپال اور متداول دیوان غالب پر مشتمل ہے۔

---

۴ امتیاز علی عرشی۔ غالب کا خود نقل کردہ نسخہ دیوان اردو۔ آجکل جولائی ۱۹۶۹ء

۵ سید وقار عظیم۔ غالب کی تلاش۔ نقوش غالب نمبر ۳ ص ۵۰۱۔

۶ مولانا غلام رسول مہر۔ بیاض غالب کی دریافت۔ نقوش غالب نمبر ۳ ص ۵۱۱۔

۷ آل احمد سرور۔ پورے غالب۔ فکر و نظر غالب نمبر علی گڑھ ص ۱۱۷

۸ گل رعنا۔ وزیر الحسن عابدی ص ۴۸

۹ امتیاز علی عرشی۔ مقدمہ دیوان غالب فارسی (مرتبہ عرشی) کے چند اوراق شاعر غالب نمبر ۱۹۶۹ء ص ۵۲۲

۱۰ نسخہ حمیدیہ اور میاں فوجدار محمد خاں۔ نادم سیتاپوری۔ فروغ اردو غالب نمبر ص ۴۴۔

۱۱ نسخہ حمیدیہ۔ مرتبہ پروفیسر حمید احمد خاں ص ۲۲-۲۳

تنویر علوی

نسخۂ مجلس پریس

(دیوان ذوق کا ایک نادر مطبوعہ)

ذوق مرحوم کا کوئی مجموعۂ کلام اُن کی زندگی میں شائع نہیں ہوا ان کی وفات (۱۲۷۱ھ) کے بعد ان کا دیوان مطبع احمدی واقع شاہدرہ دہلی سے ۱۲۷۹ھ میں پہلی بار اشاعت پذیر ہوا اس کی ترتیب و اشاعت کے کام میں مرحوم کے شاگرد حافظ ویران، ظہیر دہلوی اور ان کے چھوٹے بھائی امراؤ مرزا انور نے بطور خاص حصّہ لیا تھا۔ یہ نسخہ جس اہتمام کے ساتھ اشاعت پذیر ہوا تھا اس کا تقاضہ تھا کہ اس کے حقوق اشاعت کو محفوظ کر دیا جائے۔ لیکن اس عہد میں کلام ذوق کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے بعض اہل مطابع نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور اصل نسخہ کا حوالہ نہ دیتے ہوئے اس کا متن چھاپ دیا۔ غالباً سب سے پہلے یہ کوشش مطبع محمدی کی طرف سے عمل میں آئی اور قانونی گرفت سے بچنے کے لئے کارپردازان مطبع نے اس کے سنہ اشاعت کو نسخہ ویران پر تقدم کا شرف بخش دیا چنانچہ اس اشاعت کے آخری صفحہ ۱۸۲ پر اس کا سنہ اشاعت اس طور پر دیا گیا ہے۔

"شکر خدا کہ دیوان ذوق در مطبع محمدی محمد مرزا
صاحب واقع دہلی کوچہ چیلاں گذر فیض بازار بہ ماہ مارچ
سنہ ۱۸۵۹ء تمام گردید"

جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ نسخہ، نسخۂ ویران سے بھی تین ساڑھے تین برس پہلے سنہ ۷۶-۱۲۷۵ھ میں شائع ہو چکا تھا، جبکہ اس کا کوئی امکان نہیں۔ نسخہ ویران کے مرتبین کسی ایسے نسخہ کی موجودگی سے بالکل بے خبر ہیں، علاوہ بریں اس وقت ہنگامہ ۱۸۵۷ء اور اس کے اثرات مابعد کو دیکھتے ہوئے دہلی کے حالات ہی اس کی اجازت نہیں دے سکتے تھے کہ پہلے تو کارپردازان مطبع ذوق کے کلام کی فراہمی و جمع آوری کی طرف دھیان دیں اور پھر اس کی اشاعت مذکورہ سنہ کے نسبتاً ابتدائی زمانے میں عمل میں آجائے اس کے ساتھ کوئی دیباچہ یا قطعۂ تاریخ بھی نہیں ہے جو اشاعتہائے اوّل کے ساتھ عام طور پر موجود ہوتا ہے، جس سے اس کی ترتیب و اشاعت کی مہم پر کوئی روشنی پڑ سکے۔

گمان غالب ہے کہ یہ نسخہ، نسخۂ ویران کی اشاعت کے بعد کے قریبی زمانہ میں شائع ہوا اپنے مشمولات کے اعتبار سے بھی یہ نسخہ نسخۂ ویران کی نقل ہے اور بس۔

نسخۂ مجلس پریس بھی اس نسخے کی ایک دوسری کوشش ہے اس پر تاریخ طباعت درج نہیں اور نہ ہی کسی نسخہ مبنی علیہ کی طرف کوئی اشارہ ہے۔

اس نسخہ کی قدامت کا اندازہ نسخۂ مخزن العلوم غازی آباد سے ہوتا ہے اور یہی وہ واحد قدیم نسخہ ہے جو اپنے سے قدیم تر اس نسخہ کے حوالہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس نسخہ کی موجودگی کا پتہ کسی اور وسیلہ سے نہیں چلتا۔

مطبع مخزن العلوم غازی آباد کا یہ مطبوعہ سنہ ۱۲۸۳ھ سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ اس نسخہ کے صفحہ ۱۲۷ پر جہاں دیوان غزلیات اختتام پذیر ہوتا ہے خاتمۃ الطبع کے عنوان سے یہ سطور سپرد قلم کی گئی ہیں۔

" الحمد للہ والمنۃ کہ نسخہ دیوان ہذا المشتہر بہ دیوان ذوق کہ طوطی ہند شیخ محمد ابراہیم المتخلص بہ ذوق دہلوی کا ہے بتاریخ ۱۰ماہ صفر المظفر سنہ ۱۲۸۳ھ نبوی مقدس مطابق ۲۳ جولائی سنہ ۱۸۶۶ء عیسوی بروز سہ شنبہ کو مطبع مخزن العلوم غازی آباد ضلع میرٹھ میں بہ تصحیح و تنقیح مالا کلام کارپردازان مطبع کے اہتمام سے منطبع ہو کر مذاق بخش اہل سخن ہوا اور نسخہ موصوفہ مطبوعہ مجلس پریس سے نقل کیا گیا۔ اطلاعاً ضبط تحریر میں آیا۔"

مخزن العلوم والا یہ نسخہ سنہ ۱۲۸۳ھ میں اس مطبع سے پہلی بار شائع نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تیسری اشاعت تھی جیسا کہ صفحہ ۱۵۱ پر جہاں قصائد اور اشعار متفرقات کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، "تمت" کے ذیل میں لکھی جانے والی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

" الحمد للہ والمنۃ کہ دیوان ذوق بار سوم در مطبع مخزن العلوم غازی آباد باہتمام کنور دوارکا پرشاد در قالب طبع درآمد۔"

اس عبارت کے دائیں طرف ۱۲۸۳ اور بائیں طرف ۱۸۶۶ء تحریر ہے جس کے واضح طور پر یہ معنی ہیں کہ سنہ مذکور میں یہ نسخہ تیسری بار مطبع مخزن العلوم غازی آباد میں طبع ہوا اور کارپردازان مطبع کے اعلان کے مطابق یہ نسخہ موصوفہ مجلس پریس کے مطبوعہ نسخہ سے نقل کیا گیا تھا جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مجلس پریس والا نسخہ مخزن العلوم کی اشاعت اوّل سے بھی پہلے شائع کیا جا چکا تھا اور از روئے قیاس یہ وہی زمانہ ہونا چاہئے جب نسخۂ ویران اشاعت پذیر ہوا تھا۔ ذوق پر میرے اپنے تحقیقی کام اور ترتیب کلیات کے دوران مجلس پریس والا یہ نسخہ راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذرا اور مخزن العلوم کے نسخہ کے علاوہ کسی دوسرے وسیلے سے اس کے بارہ میں اطلاع پانی بھی ممکن نہ ہو سکی۔ حیدرآباد، علی گڑھ، رامپور، لاہور اور پٹیالہ وغیرہ مقامات کی لائبریریوں میں بھی کہیں اس کی نشاندہی نہ کی جا سکی حال ہی میں دارالعلوم دیوبند کے کتاب خانے کی سیر کے دوران اس کی زیارت نصیب ہوئی اور یہ نایاب نسخہ

میرے مطالعہ میں آیا جس کا تعارف پہلی بار ہماری زبان کے ذریعہ اس کے قارئین سے کرایا جا رہا ہے۔

اس کا نمبر سلسلہ کتاب خانے کی فہرست میں ۶۶۷۸ ہے اور کتاب کا اپنا نشان شمار ۶۲۱ - یہ نسخہ مکمل حالت میں ہے سرورق مزین اور بہت دیدہ زیب ہے اور اسے قدیم زمانہ کی تزئین کاری کا بہت اچھا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کی پیشانی "ان من السحر" کے الفاظ سے آراستہ ہے اس کے بعد مزین پس منظر اور سادہ حروف میں دیوان ذوق خوبصورت نستعلیق خط میں لکھا ہوا ہے بائیں صفحہ دل آویز حاشیہ کے مابین در مجلس پریس دہلی طبع شد۔ درج ہے۔

تاریخ کتابت یا سنہ طبع جیسا کہ اس سے پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے درج نہیں اور غالباً ایسا عمداً کیا گیا ہے تقطیع میں لمبائی دس انچ سے کچھ زیادہ اور چوڑائی ساڑھے چھ انچ کے قریب ہے خطی جدول طول میں ساڑھے نو انچ سے اور عرض میں ساڑھے پانچ انچ سے کچھ زیادہ ہے۔ سلسلۂ اشعار درمیانی صفحے اور حواشی میں مسلسل ہے درمیانی حصہ کا مسطر ۱۴ سطری ہے اور حواشی کی سطر کاری ۲۸ سطری۔ صفحات کی تعداد ۸۰ ہے اور قطعہ خاتمہ کے بعد جو تاریخ سے متعلق نہیں تمت بالخیر والعافیت درج ہے اور بس، اس کا اظہار نہیں کیا گیا کہ یہ نسخہ کب ترتیب پایا اور کس نے اسے ترتیب دیا۔ یا اس کا منقول عنہ نسخہ کون ہے وغیرہ۔ کاغذ ہلکے مٹیالے رنگ کا ہے اور یہ بہت اچھی حالت میں ہے۔

یہ دیوان اپنی موجودہ شکل میں صرف غزلیات اور اشعار متفرقات غزلیات پر مشتمل ہے اور حصۂ قصائد سے محروم ہے جب کہ دوسرے تمام قدیم مطبوعہ نسخوں میں وہ قصائد اور اشعار متفرقات قصائد موجود ہیں جو نسخہ دیوان میں شامل ہیں۔

اس کے مشمولات حسب ذیل ہیں (ردیف کے بعد قوسین میں اوپر تعداد زمین ہائے سخن اور نیچے تعداد اشعار درج کی گئی ہے) ردیف الف مع اشعار متفرقات غزلیات ناتمام ردیف الف (۲۳/۲۵۵)۔ ردیف ب (۴/۴۴) ردیف ت (۲/۲۰) ردیف ج تازی ایک شعر، ردیف چ فارسی ایک شعر ردیف حائے حطی (۱/۹) ردیف خائے معجمہ (۱/۱۲) ردیف دال مہملہ (۱/۲) ردیف ذال معجمہ (۱/۲) ردیف رائے مہملہ مع اشعار متفرقات ردیف رائے مہملہ (۲/۲۱) ردیف س کی نشان دہی اس نسخہ میں نہیں کی گئی اس کے ضمن میں صرف دو مطلع آئے ہیں ردیف صاد مہملہ (۱/۹) ردیف ضائے معجمہ (۱/۹) ردیف عین مہملہ کے ذیل میں صرف ایک مطلع آیا ہے یہی صورت ردیف ق کی ہے ردیف کاف تازی (۱/۴) ایضاً ایک مطلع ردیف ل (۳/۲۸) ردیف میم (۳/۳۰) ردیف ن مع اشعار متفرقات ردیف ن (۴۴/۴۸۷) ایضاً قطعہ (۱/۳) ردیف واو (۱۲/۱۱۹) ایضاً دس مطلع ردیف ہائے ہوز (۵/۴۰) ایضاً نو مطلع ردیف یائے تحتانی مع اشعار غزلیات ناتمام (۵۲/۵۴۲) ایضاً فرد، قطعات (۴/۱۴) رباعیات ۱۰

اس نسخہ کے مندرجات اور نسخہ دیوان کے مشمولات میں کوئی مابہ الامتیاز فرق نہیں ہے یہاں تک کہ غزلیات کا جو حصہ اس میں نقل کیا گیا ہے اس میں ناتمام غزلوں اور اشعار متفرقہ کے ضمن میں جو اشارات اور الفاظ ملتے ہیں وہ بھی نسخہ دیوان ہی کی نقل ہیں۔

صبا جائسی (علیگ)

غزل

کوئی موسم ہو مرا رنگ بدلتا ہی نہیں
نخل امید کسی آگ سے جلتا ہی نہیں

وقت کہتا ہے کہ تم خواب میں دیکھو اس کو
اور وہ شخص کسی خواب میں ڈھلتا ہی نہیں

راہ چلتے رہو پرچھائیں نہ ڈھونڈو یارو
ایسے موسم میں کوئی گھر سے نکلتا ہی نہیں

کس توقع پہ کوئی خواب سجاؤں ان میں؟
ایک آنسو بھی تو آنکھوں سے نکلتا ہی نہیں

دیکھتے دیکھتے سلگی حالات کی دھوپ
موم کی طرح کوئی آج پگھلتا ہی نہیں

مراسلات

ایک نیا تجربہ

گزشتہ ماہ جب میں سکندرآباد گیا تو میرے ایک دوست نے ایک مقامی شاعر کا کلام مطبوعہ دکھایا جو خود شاعر صاحب کا کتابت کردہ تھا۔ چونکہ کلام دقیع تھا اس لئے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا۔ میرے دوست نے یہ بھی بتایا کہ ایک اور مقامی شاعر بھی اپنا کلام خود ہی کتابت کر رہے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ کلام بھی جلد شائع ہو کر قبول عام ہو تاکہ افسانہ نویس، ڈرامہ نویس، شاعر اور ادیب حضرات کاتبوں کے چکر سے نکل کر اپنا کلام خود ہی کتابت کرکے خود ہی چھپوایا کریں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس نظریہ کو نوازا گیا اور علم برائے علم کو افضلیت دی گئی تو بہت جلد وہ ادبی سرمایہ جو مدتوں سے الماریوں کی زیب و زینت ہے چھپ کر ادب دوستوں کے ہاتھوں پہنچ جائے گا۔

حیدرآباد ● حبیب احمد

موسیقی کی کتاب درکار ہے

امریکہ کے ایک پروفیسر نارمن زائیڈ صاحب کو موسیقی کی ایک کتاب "سرمایۂ عشرت معروف بہ قانونِ موسیقی از صادق علی خاں مطبوعہ ۱۸۷۰ء دہلی" درکار ہے۔ کوئی صاحب اپنا استعمالی نسخہ الگ کرنا چاہیں تو مندرجہ ذیل پتے پر خط و کتابت کریں۔
ڈاکٹر عبدالغفار شکیل ڈیپارٹمنٹ آف لنگوسٹکس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

ڈائرکٹر خط و کتابت اردو کورس جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام چند خطوط

(۱)

پریہ مہودے
دھرم یگ کے دگیاپن پرشٹھوں پر آپ کا وگیاپن دیکھ کر ہرش ہوا۔ اردو بھاشا کی جانکاری کے لئے میں بہت دنوں سے پریتن شیل تھا پرنتو کہیں سے سہیوگ پراپت نہ ہو سکا۔ ہمارے یہاں بھی اردو پڑھنے کی کوئی سودھا نہیں ہے۔ جبکہ اس بھاشا کی نزاکت پر میں اتینت آکرشت ہوں۔ آپ کو کتنا دھنیہ واد دوں کہ آپ نے ایسی سنستھا چلا کر کتنا بڑا کاریہ کیا ہے۔ میں پاٹھیہ کرم پورن کرنا چاہتا ہوں۔ اتاہ: پاٹھیہ کرم و پرویش پتر بھیجئے پھر پرویش پتر پورن کرکے دو روپے سمیت بھیج دوں گا۔ پتہ آگے لکھا ہے۔ شیگھر ہی بھیجئے۔ میں پرتیکشا رت رہوں گا۔ پرویش پتر و پاٹھیہ کرم کے انتظار میں۔

● رام نرائن سنگھ

(۲)

مہودے۔
دھرم یگ پتریکا کے نئے انک میں آپ کا وگیاپن دیکھا اردو نہ جاننے والوں کے لئے گھر بیٹھے ہندی کے دوارا اردو کی مفت شکشا کا پربندھ سلبھ دینے پر آپ نے ایک بڑا کام کیا ہے۔ اس کی اتینت آوشیکتا بھی تھی۔ اردو جیسی سندر بھاشا کو جیوت رکھنے کے لئے ایسے ہی پریاسوں کی ضرورت ہے۔ مجھے اردو پڑھنے لکھنے کا بہت ہی چاؤ رہا ہے پرنتو سادھن جٹ نہیں پایا۔ میرے پتی اردو پڑھتے لکھتے ہیں۔ گھر میں اردو کی پتر پتریکائیں برابر آتی ہیں۔ میں پڑھ نہیں پاتی اور من مسوس کر رہ جاتی ہوں میرے پتی اتنے ویست رہتے ہیں کہ انھیں مجھے اردو پڑھانے کے لئے سمے نکالنا سمبھو نہیں ہو پاتا۔
کرپیا پاٹھیہ کرم تتھا پرویش پتر مجھے نیچے لکھے پتے پر بھجوا دیں میں پورے کورس کا ڈاک خرچ ۲/- پرویش پتر کے ساتھ بھیج دوں گی۔

میرٹھ۔ بھودیا کرشنا بجاج

(۳)

مکرمی!
۱۔ عرض ہے کہ خط و کتابت اردو کورس کے لئے محمد سلیمان صدیقی بی ایس سی فائنل کا فارم داخلہ روانہ ہے۔ رسید منی آرڈر (دو روپے) نمبر ۹۲۴ تاریخ ۲۵ فروری ۸۲ء (برائے فیس مطلوبہ) علاوہ ازیں ڈاکٹر ریاض احمد ایم بی بی ایس اور شہزادے خاں بی ایس سی (انجینیرنگ) کے فارم بمعہ فیس پہلے ہی روانہ ہو چکے ہیں۔ ازراہ کرم جلد از جلد انھیں ممبر بنا کر کورس جاری کریں۔
۲۔ آپ کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ جامعہ کی اس مفید اسکیم کے ساتھ بھرپور عملی تعاون کی غرض سے انجمن کے تعلیمی ادارہ مفت زیری پرائمری و جونیر ہائی اسکول میں اس قسم کے لوگوں کی بلا معاوضہ رہنمائی کے لئے معقول بندوبست کر دیا گیا ہے۔
۳۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو کچھ داخلہ فارم اور قواعد و ضوابط کی کاپیاں روانہ کر دیں تاکہ ضرورت مند حضرات دفتر سے بآسانی حاصل کر سکیں۔
۴۔ اس سلسلہ میں میرے لائق خدمات سے مجھے یاد کرتے رہا کریں فوری جواب کا منتظر۔

کانپور۔ ● محمد شریف سکریٹری

(۴)

مناسب ہوگا کہ پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں میرا نام شاہد محمود ہے

انٹرمیڈیٹ اور انجینئرنگ میں ڈپلوما ہولڈر ہوں۔ ایک مقامی انجینئرنگ فرم میں ورکشاپ انچارج ہوں اور افتادِ طبع کا شکار ہوکر ایک اردو اخبار کا ایڈیٹر نکالتا ہوں جو کسی نہ کسی طرح چھ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ اردو کا خادم ہوں، اردو میں شعر کہتا ہوں مضامین لکھتا ہوں اور یہ بھی سوچتا رہتا ہوں کہ اس زبان کے لئے کیا کیا کیا جائے۔

میرا اپنا ایک نظریہ ہے کہ اگر کچھ لوگوں کو جو اردو سے نابلد ہیں خاص طور پر ملک کے اکثریتی فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد کو اردو سکھائی جائے تو یہ اردو کی سب سے بڑی خدمت ہوگی اس مقصد کے لئے حتی الامکان کوشاں رہتا ہوں۔

آج ہی میرے پاس ایک صاحب نیرنج کمار ماتھر آئے انھوں نے مجھے آپ کے ذریعہ جاری کیا ہوا مراسلاتی نصاب دکھایا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے برسوں کی ایک مراد آج پوری ہوگئی۔

رامپور میں بیٹھ کر میں آپ کے کیا کام آسکتا ہوں یہ آپ کے سوچنے کی بات ہے بہر حال میرا قلم، میرا اخبار اور بذاتِ خود میں آپ کے اس نیک مشن میں بھرپور طور پر شریک ہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ میں اپنے اخبار کے آفس میں انسٹی ٹیوٹ کی طرح اردو پڑھانے کا انتظام کردوں، دراصل ہوتا یہ ہے کہ ہم کسی ایسے شخص کو جو اردو سے ناواقف ہے جس کا اردو سے کوئی جذباتی رشتہ نہیں ہے اس بات کے لئے مجبور نہیں کرسکتے کہ وہ ایک روپیہ ماہوار بھی ہمیں دے کر یا اردو کی کتابیں خرید کر اردو سیکھے ابھی یہ استطاعت نہیں ہے کہ اردو سیکھنے والوں کے لئے کتابیں، کاپیاں وغیرہ چھپائی جائیں لیکن اس میں اگر آپ مدد فرمائیں تو یہ مسئلہ بخوبی حل ہوسکتا ہے، اردو انسٹی ٹیوٹ کی کوئی ٹیوشن فیس نہیں ہوگی۔ خط کتابت کا خرچ میں خود برداشت کروں گا، میرا آفس، فرنیچر، بجلی یہ سب موجود ہی ہیں، میرے پاس طلبہ بھی ہیں باقی کوشش کرنے پر مہیا ہوسکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر آپ مجھے راہ دکھائیں کہ میں اس کام کو کس طرح تکمیل پہنچاؤں یا آپ کا اردو مراسلاتی نصاب میرا کس حد تک معاون ثابت ہوسکتا ہے تو بے حد ممنون ہونگا۔

جو طلبہ بھی میرے ذریعہ اردو سیکھیں گے وہ براہِ راست آپ کے طالب علم ہوں گے آپ کی ہدایت پر ہی عمل کریں گے، میرا تعلق صرف یہ ہوگا کہ میں ان لوگوں کو جو اردو سے ناواقف ہیں کسی طرح بھی اس زبان سے آشنا کرا سکوں۔ مجھے ہر قدم پر آپ کے مشوروں کی ضرورت رہے گی ظاہر ہے کہ میری عمر ابھی کل ۲۵ سال کی ہے اگر اس خط کا جواب فوراً دیں تو بے حد شکریہ

رامپور۔ • شاہد محمود

(۵)

عرض ہے کہ میں نے خط کتابت اردو کورس کی دوسری کتاب ختم کرلی ہے۔ اس کتاب میں مجھے جو قصے اور کہانیاں پسند ہیں ان کے نام اس پرکار ہیں۔

(۱) ہماری دنیا کے مالک۔ سبق نمبر ۴

(۲) کنجوس۔ سبق نمبر ۶

(۳) چارہ وطن۔ سبق نمبر ۸

(۴) ٹیپو سلطان۔ سبق نمبر ۱۳

(۵) خوشحال کسان تندرست مزدور۔ سبق نمبر ۱۰

(۶) تاج محل۔ سبق نمبر ۱۱

(۷) میرا بچپن۔ سبق نمبر ۲۲

(۸) مرزا اسد اللہ خاں غالب کی غزلیں پسند آئی اور اس کتاب میں یہ کیا ہوا سبق نمبر ۲ بیکار رنگا سبق نمبر ۱۲ موسم بہار میں چھٹا مسترہ یہ قدرت کا ہے کدرتی انتظام کیلئے پھول لاکھوں طرح کے نام مداس میں فہرست لفظ دیا ہے اس کے مانے آپ کے نیچے لکھتیں وہ فہرست کے معنی کو مت لکھے ہیں یہ مجھے کم نہیں آئے اس کا پورا پورا مانے لکھ کر بھیجیں اور یہ کتاب ختم ہونے کی وقت سے آپ کتاب اردو کورس کی تیسری کتاب بھیج دینے کی مہربانی کریں۔

دہلی۔ • جے رام شرما

مظفر حنفی

غزل

ان سے تعلقات نہیں ہیں کھلے ہوئے
اور قطرہ ہائے خوں ہیں کہ ضد پر تلے ہوئے

اے چوٹ تیشہٴ فرہاد کی قسم
دیکھے ہیں میں نے دودھ سے پتھر دھلے ہوئے

اک وار بھی سہا نہ گیا مخلصین کا
ہم لوگ آدمی نہ ہوئے بلبلے ہوئے

دورانِ فکرِ شعر یہ فرصت کہاں کہ ہم
الفاظ لائیں شہد و شکر میں گھلے ہوئے

یوں بھیڑ میں چھپی ہے مری انفرادیت
جس طرح ریگزار میں موتی رُلے ہوئے

•

اخبار و اذکار

اردو کے بغیر ہندوستان کا تہذیبی نقشہ نامکمل

نئی دہلی:۔ مرکزی وزیر حکمت جناب آئی۔ کے گجرال نے مولانا آزاد کی برسی کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو اس ملک کی زبان ہے ہندوستان کی تہذیب میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہے اردو کو الگ کر کے اس ملک کا کوئی تہذیبی نقشہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ لسانی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ کبھی کہا جاتا ہے کہ اردو ہندوستان کی زبان نہیں کبھی یہ کہ اردو بولنے والے ہندوستانی نہیں ہیں، یہ باتیں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور جمہوریت کے خلاف ہیں اردو بھی ہندوستانی ہے اور اردو بولنے والے بھی ہندوستانی ہیں اردو اس ملک کی اور اس دھرتی کی زبان ہے۔ • الجمعیتہ دہلی

دہلی میں اردو اور پنجابی کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے

نئی دہلی:۔ دلی کے سرکردہ کانگریسیوں نے گزشتہ روز اکالی لیڈر سردار جیپال سنگھ اور ان کے ساتھیوں سے ملاقات کی اور انھیں بتایا کہ دہلی پردیش کانگریس کمیٹی اس حق میں ہے کہ دلی میں پنجابی اور اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔

• سیاست جدید کانپور

اردو والوں کو ملازمتوں کے مواقع دینے کا وعدہ

حیدرآباد:۔ چیف منسٹر جناب پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ نے میسرم میں ایک انتخابی جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ریاستی حکومت بشمول اردو تمام اقلیتی زبانوں کو فروغ دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گی یہ حکومت کی پالیسی ہے کہ اردو اور تمام اقلیتی زبانیں بولنے والوں کو تعلیمی سہولتیں اور ملازمتوں میں مواقع حاصل ہوں بعض گوشوں سے حکومت کی لسانی پالیسی پر نامناسب تنقید کر کے غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میں نے کئی بار واضح کیا کہ تلگو ریاست کی سرکاری زبان ہے اور تلگو کو نظم و نسق کے علاوہ جامعاتی سطح پر بھی رائج کیا جا رہا ہے اس کے ساتھ ہی اردو زبان و دیگر اقلیتی زبانوں کو بھی ترقی کے مواقع فراہم کیے گئے ہیں اور سرکاری اغراض کے لیے ان زبانوں کے استعمال کا حق دیا گیا ہے۔ حکومت کسی بھی انگریزی زبان کو تلگو اردو اور دوسری اقلیتوں کے مقابل ترجیح نہیں دے گی چیف منسٹر جناب پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ نے سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے حکومت کی لسانی پالیسی کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی۔ انھوں نے کہا کہ تلگو اردو کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ انگریزی ہی رکاوٹ بن سکتی ہے ہمارے ملک کی زبانیں آپس میں سہیلی کی طرح ہیں۔ اردو داں افراد کو ملازمتوں میں مواقع کا ذکر کرتے ہوئے چیف منسٹر نے بتایا کہ تلگو داں اور اردو داں افراد کو ملازمت دی جائے گی میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ملازمتوں میں اردو والوں کو اولیت دی جائے یہ تو ہمارے ملک کے ہر حصہ میں بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے۔ میں اردو اور تلگو دونوں زبانوں کو پروان چڑھانا چاہتا ہوں۔ انگریزی کے بجائے اردو اور تلگو کے گر کوشش چاہتا ہوں۔

• روزنامہ سیاست حیدرآباد

اردو کے لئے پالیسی اور عمل میں یکسانیت کا مطالبہ

حیدرآباد:۔ تیرہ سرکردہ شہریوں نے جن میں ماہرین نظم و نسق دانشور اور سیاسی رہنما بھی شامل ہیں ایک مشترکہ بیان میں آندھرا پردیش میں اردو کے ساتھ منصفانہ سلوک کا مطالبہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تلگو کو ریاست کی سرکاری زبان بنانے سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں ہے، تاہم ہم چیف منسٹر کی اس رائے کو نزاعی قرار دیتے ہیں کہ ہمارے نظم و نسق میں انگریزی کو جو ترجیحی مقام حاصل ہے اسے باقی نہیں رکھا جانا چاہیے۔ جناب نرسمہا راؤ نے میسرم کے ایک جلسہ عام میں ریاست کے تعلیمی اور نظم و نسق سے متعلقہ شعبوں میں اردو کے مستحقہ مقام کی وضاحت کی ہے اور اسی کی بنا پر ہم صاف گوئی سے کام لینے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ ہم ان کے اسی خیال کی صد فیصد تائید کرتے ہیں کہ تلگو کو ریاست کی سرکاری زبان بنانے کے سلسلہ میں موثر اقدامات کئے جانے چاہئیں اور انگریزی کا موجودہ ترجیحی موقف برقرار نہیں رکھا جانا چاہئے لیکن ہمیں دکھ اور افسوس کے ساتھ ہم اس تضاد کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں جو چیف منسٹر کی میسرم کے جلسہ کی تقریر اور ان کے نظم و نسق کے طریقہ کار میں پایا جاتا ہے۔

حکومت جونیر کالجوں میں طلبہ اور طالبات کو ان کی پسند کے مضامین اختیاری دینے پر انکار کر رہی ہے۔ نتیجتاً ان طلبہ اور طالبات کو دوسرے ذریعہ تعلیم کے کالجوں میں داخلہ لینا پڑ رہا ہے۔ اردو میں نصابی کتب کی اشاعت کی صورت حال بھی افسوسناک ہے۔ حد یہ ہے کہ اردو میڈیم کے اداروں کے لئے موزوں اساتذہ تک کا انتظام نہیں کیا جا رہا ہے۔ سب سے زیادہ المناک بات تو یہ ہے کہ اردو میڈیم کے بیشتر مدارس میں زبان دوم کی حیثیت سے تلگو کی تدریس و تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں۔ ایسی صورت میں یہ توقع کیسے رکھی جا سکتی ہے کہ اردو میڈیم کے مدارس میں تعلیم پانے والے یہ لڑکے اور لڑکیاں آندھرا پردیش کے معاشرہ میں جذب ہو سکیں گی اور ریاست کی ترقی میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا انھیں بھی موقع ملے گا۔ جہاں تک سرکاری جائیدادوں پر تقررات کے مسئلہ کا تعلق ہے چیف منسٹر جی۔ او نمبر (۱۰۰۰) مورخہ ۱۲۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کی اجرائی سے انکار نہیں کر سکتے۔ جس کے تحت اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ اور طالبات کو بعض جائیدادوں پر راست تقرر کی سہولت سے بالکلیہ محروم کر دیا گیا ہے۔ تلگو سے واقفیت کے نام سے اس جی۔ او کے ذریعہ یہ وضاحت کی گئی ہے کہ صرف تلگو میڈیم کے کالجس سے فارغ التحصیل طلبہ ہی تلگو سے واقف تصور کئے جائیں گے۔ یہ صورت حال ریاستی نظم و نسق کے جانبدارانہ رویہ کی نمائندگی کرتی ہے۔　● سیاست حیدرآباد

اردو داں افراد کے لئے ملازمتیں دینے کے وعدہ کا خیر مقدم

حیدرآباد۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی نے ایک صحافتی بیان میں کہا ہے کہ یہ امر محبان وطن کے لئے عموماً اور اردو دوستوں کے لئے خصوصاً باعث طمانیت ہے کہ ہمارے بڑے وزیر جناب نرسمہا راؤ صاحب نے اپنی حیدرآباد والی تقریر میں اعلان کیا کہ تلگو داں اور اردو داں افراد کو ملازمت کے مواقع دئے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ اس واضح اعلان کے بعد ہماری موجودہ حکومت کی پالیسی اس آرڈر کے متوازی ہو گئی جسے آندھرا پردیش کے قیام کے بعد پے درپے بڑے وزیروں نے اپنایا تھا۔ جو لوگ اردو کی مخالفت کرتے ہیں انھیں اس بات کا اندازہ نہیں کہ وہ قومی یکجہتی کے اصول پر کیسی ضرب لگاتے ہیں۔ یہ زبان نام نہاد "علاقائی زبانوں" کی طرح کوئی مقامی زبان نہیں بلکہ اس کی نوعیت کل ہند زبان کی ہے۔ پھر جہاں تک اس کے لسانی ڈھانچہ کا تعلق ہے یہ ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان کی تمام زبانوں کے الفاظ چن چن کر بلا تکلف اپنی لغت میں شامل کر لیتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ عام چناؤ کے بعد جب آندھرا پردیش میں نئی اسمبلی قائم ہو تو یہ اعلان محض طاق کی زینت نہ بن جائے بلکہ ہماری حکومت نچلی سطح کے ذمہ دار عہدہ داروں کو اس کی ہدایت کرے بلکہ حکم دے کہ جن طلبہ نے اردو میں تعلیم پائی ہے اور جنھوں نے تلگو میں تعلیم پائی ہے ان کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہ کی جائے اور نہ کسی زبان کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جائے۔ انھوں نے کہا کہ انجمن ترقی اردو نے اردو نصابی کتابوں کی کم و بیش حد و میعت کی طرف جو توجہ دلائی ہے اس کمی کو پورا کرنے کے احکام صادر کر دئے جائیں تاکہ اردو میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا موقع مل جائے۔　● سیاست حیدرآباد

اردو قومی اتحاد کی مظہر ہے

حیدرآباد۔ مرکزی وزیر برائے کمپنی امور جناب کے وی رگھوناتھ ریڈی نے ایک انتخابی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان قومی یکجہتی کا مظہر ہے۔ حکومت ہند اردو کو اس کا جائز مقام دینے میں کوئی پس و پیش نہیں کرے گی۔ انھوں نے کہا کہ اردو والوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اردو کی ترقی ترویج اور اشاعت کے لئے منصوبہ بند پروگرام مرتب کرتے ہوئے اس پر عمل کریں۔
● سیاست حیدرآباد

اردو جماعتوں کا قیام

جگتیال:۔ گورنمنٹ آرٹس کالج جگتیال میں اردو میڈیم کی اردو جماعتوں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ رسم افتتاح کے موقع پر پرنسپل کالج جناب دی کنڈل راؤ نے سرپرستوں اور طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ماہرین تعلیم کی یہ رائے صداقت پر مبنی ہے کہ مادری زبان ہی بہترین ذریعہ تعلیم ہوتی ہے۔ تمام زبانوں میں تعلیمی سہولتیں فراہم کی جانی چاہئیں۔ ان میں اردو پیش پیش ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے خاطر خواہ سہولتیں حاصل نہیں ہیں۔ پرنسپل کالج نے توقع ظاہر کی اردو داں اصحاب ان دشواریوں کو سمجھتے ہوئے عطیوں جات اور اضلاع میں اردو داں اساتذہ کے تقرر کے لئے مساعی انجام دیں گے۔　● سیاست حیدرآباد

ناصر کاظمی کے انتقال پر تعزیتی جلسہ

علی گڑھ:۔ ۸ر مارچ۔ اردو کے ممتاز شاعر ناصر کاظمی کا ۲ر مارچ کو لاہور میں انتقال ہو گیا۔ اس سانحہ ارتحال پر ایک تعزیتی جلسہ شعبۂ اردو مسلم یونی ورسٹی میں پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں اردو کے ادیب، شاعر، استاد، ریسرچ اسکالر اور طلبہ شامل تھے۔ سرور صاحب نے

ناصر کاظمی کی شاعری اور ان کی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال فرمایا اس کے بعد یہ قرارداد منظور کی گئی۔

"انجمن اردوئے معلیٰ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا یہ جلسہ اردو کے ممتاز شاعر ناصر کاظمی کی اچانک اور ناوقت وفات پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے ناصر کاظمی کا نام جدید شعرا میں سر فہرست ہے آزادی کے بعد اردو غزل جن چند شعرا کی بدولت ایک نئی جہت سے آشنا ہوئی اس میں ناصر کاظمی کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کا مجموعہ کلام برگ نے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کی غزلوں میں طرز احساس اور طرز اظہار دونوں کے اعتبار سے جو تازگی ملتی ہے اس کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ یہ کہنا غالباً بے جا نہ ہوگا کہ ہندوستان و پاکستان کے جدید تر شعرا میں سے بیشتر نے ناصر کاظمی سے کسی نہ کسی حد تک اثر قبول کیا ہے۔

ناصر کاظمی صرف شاعر ہی نہیں تھے نثر نگاری میں بھی ان کا اپنا اسلوب تھا۔ چند سال پہلے میر کی شاعری پر ان کا جو مضمون "سویرا" میں شائع ہوا تھا اس میں میر کا مطالعہ ایک نئے اور انوکھے زاویے سے کیا گیا تھا۔

ناصر کاظمی کی عمر اس وقت تقریباً ۴۷ سال تھی وہ کچھ دنوں میاں بشیر احمد کے رسالہ 'ہمایوں' کے جوائنٹ ایڈیٹر رہے تھے اس کے بعد انتظار حسین کے ساتھ مل کر "خیال" کے نام سے ایک دو ماہی پرچہ لاہور سے جاری کیا تھا۔ گذشتہ چند برسوں سے وہ ریڈیو پاکستان سے منسلک تھے۔ ناصر کاظمی کی جواں مرگی اردو ادب کا ایک المناک حادثہ ہے۔ ہم ان کے اعزا و احباب اور ان کے پرستاروں اور مداحوں کے غم میں شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انھیں اپنی رحمت بے پایاں سے سرفراز کرے۔ •نامہ نگار

صفحہ ۱۲ سے آگے

ہی منقطع ہوگئی۔ بھلے ہندوستانی قارئین سے بات کرنے کی تو اجازت دے رہے ہیں، مگر بات کرنے کا جو سب سے موثر وسیلہ ہے، ادب و دانش کا تبادلہ، باہم اسے برقرار کرنے پر آمادہ نہیں۔ میرا ایمان ہے کہ شاعر اور ادیب ہی ملکوں کے درمیان دوستی اور محبت کے بہترین سفیر ہوتے ہیں۔ ہمارے سیاسی حالات و مصالح مختلف سہی، مگر احساس کی زبان مختلف نہیں۔ ہمارے درمیان آگ اور خون کی سرحد سہی، مگر دلوں کے درمیان ایسی کوئی حد بندی نہیں۔ ہماری تقسیم ایک سیاسی حادثہ سہی، مگر ہماری تہذیبی یگانگت کو تقسیم اور پھر جنگ کے سانحوں نے آلودہ نہیں کیا۔ غلام محمد کی موت، ایوب کی معزولی، یحییٰ خاں کے زوال اور بڑے سے بڑے صاحب اقتدار کا خاتمہ ہمارے لیے شہ سرخیوں کے بنائے ہوئے سیاہ بے جان بے معنی حروف سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ لیکن ناصر کاظمی کی موت کی خبر ریڈیو کی مشینی آواز میں ڈھل کر بھی، ہمارے دلوں کو چھوتی اور ہماری آنکھوں میں آنسو بن کر چمکتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستانی اخباروں کے پہلے صفحے پر پاکستانی جرنیلوں کی بڑی بڑی جلی حروف میں لکھی ہوئی خبر بنتی رہے گی۔ مگر ناصر کاظمی کی موت شاید پچھلے صفحات کا کوئی گوشہ ہی پا سکے۔ مگر اخبار میں چھپی ہوئی بڑی سے بڑی خبر دوسرے دن باسی ہو جاتی ہے اس لئے ہر خبر بے معنی ہے۔ اچھا ہے جو ہم اپنے مشترکہ تہذیبی ورثے کے امانت داروں کی خبروں کو ان بے معنی اور مر جانے والی خبروں میں جگہ نہیں دیتے۔ یہ خبریں تو دلوں سے دلوں تک پہنچنے اور آنکھوں سے آنکھوں تک سفر کرنے کے لئے ہوتی ہیں۔ مخدوم کی موت پر بھی پاکستانی اخباروں نے ایک بے جان خشک سرخی کے علاوہ کوئی زندہ جگمگاتا عنوان نہ لگایا ہوگا، لیکن مجھے یقین ہے کہ اس خبر نے بھی دلوں اور آنکھوں میں سب سے روشن جگہ پائی ہوگی۔ دونوں ملکوں کی مشترکہ بدنصیبی یہ ہے کہ آزادی کے باوجود ہم نے اپنے دانشوروں اور فنکاروں کا احترام کرنا اب تک نہیں سیکھا۔ وہ وزرا و قائدین جو اپنے منصب سے ہٹتے ہی زندگی میں بھی مر جاتے ہیں، ہماری صحافت کے آج تک منظور نظر ہیں، مگر وہ شعرا جو مر کر بھی اپنی بے منصبی کے باوجود زندہ رہتے ہیں زندگی ہی میں حرف غلط کی طرح نظروں سے رہتے ہیں۔ اگر کچھ دوستوں سے بات نہ ہوتی تو شاید ابھی بہت دن تک میں ناصر کاظمی کو زندہ ہی سمجھتا۔ ایسا ہوتا تو غلط بھی نہ ہوتا۔ شاعر، اور وہ بھی ناصر کاظمی ایسا شاعر، جو شور و شغب سے دور، مروجہ مشینوں سے بے نیاز شعر کہتا رہا اور جس کی طرز فغاں خود مشین بن گئی، مرنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی غزلوں میں اب بھی زندہ ہے اور ہم جو جدید سے جدید تر مشینوں میں اسے بھول سے رہے تھے اور بھی شدت سے اسے یاد کرنے اور یاد رکھنے کی کوشش کریں گے۔

ناصر کاظمی کی آواز سے میں سنہ ۱۹۵۴ء کے آس پاس متعارف ہوا سنہ ۱۹۶۲ء میں کچھ دن کے لئے علی گڑھ آیا تو ناصر کاظمی کو خلیل کے گھر پر سجنے والی محفل شعرا میں قریب سے دیکھا۔ وہ اس محفل سے بہت دور لاہور میں تھے۔ مگر ان کی شاعری ہماری محفلوں میں شریک غالب رہی۔ خلیل اور شہریار ، برگ نے کے دلدادہ تھے، اور شاذ جعفری اس کے پرستار۔ شاذ جعفری، جن کا ذوق فن آتی اسے، انہیں کے کاروبار فنون میں گم ہو گیا، ناصر کی غزلیں ترنم سے سناتے اور ہم سب مسحور ہو کر ناصر کی باتیں سنتے۔ وہ ہمارے دل کی آواز تھی۔

'برگ آوارہ' کے بعد ناصر کاظمی کا دوسرا مجموعہ، اعلان کے باوجود شائع نہ ہوا۔ ان کی غزلیں بھی آہستہ آہستہ رسالوں کے صفحات پر کم نظر آنے لگیں۔ کچھ شاعروں نے جو توانا آوازوں کی موت ہی کو اپنی زندگی کا واحد وسیلہ سمجھتے ہیں، انھیں بھولی ہوئی صدا سمجھنے میں عافیت دیکھی۔ کچھ ناقدین نے، جن کی بدذوقی اور ادب ناشناسی ادب کے ایوان میں احمقانہ فتووں کے

(باقی صفحہ ۲ پر)

وحید اختر

میرا صفحہ

وہ ہجر کی رات کا ستارہ، وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ

ستا اشفاق حسین کہہ رہے تھے۔

"وہ رات رات بھر جاگتا اور باتیں کرتا تھا۔ جب پو پھٹتی، پرندے بولنے لگتے، وہ چپ ہو کر سو جاتا۔ آخری رات بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ رات بھر باتیں کرتا رہا، صبح ہونے لگی تو وہ چپ ہو گیا۔ آخر تک اس نے اپنی وضع نبھائی۔"

اس کی گفتگو میں غزل کی ایمائیت ہوتی تھی، اس کے اپنے اشعار کی ندرت، اس کے اپنے خیالات کی تازگی، اس کے اپنے لہجے کی انفرادیت۔ میں نے اس سے رسالے کے صفحات پر باتیں کی بھی ہیں اور اس کی باتیں سنی بھی ہیں۔

میں اس سے کبھی نہیں ملا۔ لیکن میں نے اس سے بارہا باتیں کی ہیں۔ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا، لیکن میں اسے اتنا ہی قریب سے جانتا ہوں، جتنا اپنے عزیز ترین دوستوں کو۔ اس کا چہرہ میرے لئے نا آشنا رہا، مگر اس کی آواز کا چہرہ، جو اس کی شخصیت کا شناس نامہ ہے، میری اپنی آواز کے چہرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی، اس کا ایک اور عکس لگتا ہے۔ کل رات میں اس کی تصویر ڈھونڈ رہا تھا تو وہ مجھے "فنون" غزل نمبر اسی صفحے پر ملی جس پر میری بھی تصویر ہے۔ تصویریں بات نہیں کرتیں مگر مجھے یہ گمان ہوا کہ یہ تصویریں کئی برس سے آپس میں باتیں کرتی رہی ہوں گی اس صفحے پر جو محفل جمی ہے، اس میں احمد فراز، ظفر اقبال، سلیم احمد، جمیل الدین عالی، شہزاد احمد، خلیل الرحمن اعظمی بھی شریک ہیں۔ اگر یہ ساری تصویریں بات کرتی ہوں گی تو ادب و فن کے کیسے کیسے عقدے کھلتے، اسرار فاش ہوتے اور غزل کے کتنے منفرد لہجے ایک دوسرے کے آئینے میں گھل مل جاتے ہوں گے۔ شاعری کی یہ بساط اردو ادب کے ایوان میں بیس بائیس برس سے جمی ہوئی ہے۔ وہ اس بساط پر سب سے پرانا ہوتے ہوئے بھی اپنی آواز کے لحاظ سے ہمیشہ نیا رہا۔ نئی نئی آوازیں، جو دوسرے صفحات پر عکس فگن ہیں، اس کی آواز سے اپنی شمع جلاتی رہیں۔ جو لہجے اور آوازیں اس سے مختلف ہیں، انھوں نے بھی ہمیشہ اس کی آواز کا احترام کیا۔ وہ سب سے منفرد آواز تھی، جو غزل کے ایوان میں اس وقت گونجی جب غزل نعروں کے شور میں دب چکی تھی۔ وہ آواز بلند نہ تھی، نرم تھی، اس میں طوفانوں کا شور نہ تھا، دل کی دھڑکنوں کی تحت نغمہ کیفیت تھی۔ وہ شعلہ نہ تھا، آہستہ آہستہ جلتی ہوئی شمع تھی، مگر اس کی روشنی میں ۱۹۴۷ء کے بعد کی غزل نے اپنے آپ کو پہچانا، سنوارا، نکھارا، بیسویں صدی کے اساتذۂ غزل کی پرانی نسل (حسرت، فانی، اصغر، یگانہ، جگر، فراق) کی آواز کو اس نے عصر جدید کی زبان اور کیفیات سے آشنا کیا۔ وہ غزل کی کلاسیکی روایات کا پاسدار اور جدید لہجے کا نگہدار تھا۔

۳ مارچ کو میں دہلی میں تھا، زبیر رضوی نے خبر دی "ناصر کاظمی کا انتقال ہو گیا۔" "برگ نے" سامنے رکھی ہوئی تھی، میں اور آتی برگ میں اس کی نے کی لے سے اس کی باتیں دیر تک سنتا رہا۔

علی گڑھ آیا، ۴ مارچ کو شمیم حنفی نے وہی خبر سنائی۔ وہاں خلیل اور شہریار بھی تھے۔ لاہور ریڈیو کے ان پروگراموں کا ذکر ہوتا رہا جو ناصر کاظمی کی موت پر نشر ہوئے اور جنھیں میں سن نہ سکا تھا۔ ہم سب ناصر کاظمی کی باتیں یوں کرتے رہے جیسے کوئی اپنے عزیز کی موت پر اس کی خوبیوں کا تذکرہ کرے۔

تین ماہ قبل مجھے اخبار سے اپنے ایک عزیز دوست اسد جعفری کی جواں مرگی کی خبر ملی تھی، وہ جرنلسٹ تھے اور "حیات" کے ایڈیٹر۔ کمیونسٹ پارٹی نے پورے اعزاز سے ان کی لاش کو حیدرآباد رخصت کیا، حیدرآباد نے بڑے پیار سے انھیں اپنی آغوش میں لیا، میں دہلی گیا تو آنکھیں اسد کو ڈھونڈتی اور دل یاد کرتا رہا۔

دو ماہ ہوئے کہ مجھے اپنے پھوپھیرے بھائی کی موت کی خبر ملی تھی وہ جو میرے والدین کو ہم سے زیادہ عزیز رہے تھے مر گئے تو ایسا محسوس ہوا کہ والدین سے میرا یہ کڑ ور رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ ان کے ساتھ میرا بچپن بھی مر گیا۔

لیکن ناصر کاظمی نہ تو میرے دوست تھے، نہ بھائی۔ پھر میرا قلم ان کی موت کا نوحہ خواں کیوں ہے؟

ہر وہ آواز، جس نے اندھیرے میں روشنی کی امانت کو سنبھالا اور پالا، ہماری اپنی آواز ہے۔ ایسی کوئی آواز اندھیرے میں ڈوب جائے تو ہماری اپنی آواز کے شرارے، تاروں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر اسے کھوجتے ہیں۔

ناصر کاظمی ہماری اپنی آواز تھے۔ ہمارے عہد کی ایک معتبر اور گراں مایہ امانت۔

کتابوں میں پڑھا تھا کہ لوگ میر صاحب کی غزلیں سوغات کے طور پر دوستوں کے لئے لے جاتے تھے۔ آنکھوں سے دیکھا کہ "برگ نے" چھپا تو یاران سخن سنج اسے تحفے کی طرح ایک دوسرے کو دکھاتے اور بانٹتے پھرے۔ ناصر کاظمی کی آواز ایک خوبصورت سوغات تھی جو آئندہ بھی ہند و پاک کو دوستی اور محبت کے رشتے میں باندھتی رہے گی۔

پچھلے چند مہینوں میں جو سیاسی حالات پیدا ہوئے، انھوں نے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خلیج کو گہرا اور وسیع تر کر دیا۔ دونوں ملکوں کے درمیان تبادلۂ کتب و رسائل ہی نہیں مراسلت

(باقی صفحہ "۱" پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا